غیر جمہوری ماحول کی پیداوار انتہا پسندی

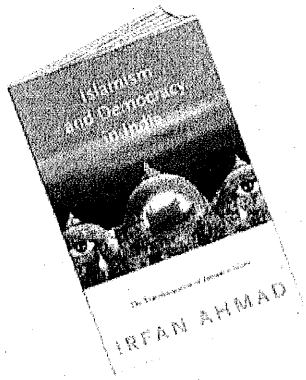

وارث مظہری

پچھلی تقریباً نصف صدی سے علمی و سیاسی حلقوں میں اس پر بحث ومباحثہ جاری ہے کہ ایا اسلام اور جمہوریت کے اصول باہم متصادم ہیں یا دونوں کے نظریات میں رفیق بن کر چل سکنے کی گنجائش موجود ہیں۔ نائن الیون کے بعد اس پر بحث میں تیزی آئی اور یہ اور اس سے متعلق موضوعات پر مختلف زبانوں میں اتنی کتابیں لکھی گئیں جو شاید گزشتہ کئی دہائیوں میں نہ لکھی گئی ہوں۔ عرفان احمد کی زیر تبصرہ کتاب اسی موضوع کے ایک اہم پہلو پر لکھی گئی ہے۔ اس وقت اسلام کو سیاسی tool کے طور پر استعمال کرنے والے اسلام پسند تمام اسلامی ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ اسلام پسندی کے نظریے کی بانی سمجھی جانے والی جماعت اسلامی ہند کے حوالے سے یہ کتاب اس نکتے پر بحث کرتی ہے کہ ہندوستان میں جمہوری عمل کے ساتھ اسلام پسندوں کے تعلقات اور کشمکش کی کیا شکل ونوعیت رہی ہے اور اس کے کیا اثرات اس کے فکری منہج اور عملی طریقہ کار پر مرتب ہوئے ہیں؟

کئی سالوں کے مسلسل مطالعے اور پرمشقت فیلڈ ورک پر مشتمل یہ کتاب کئی حیثیتوں سے انفرادیت رکھتی ہے۔ اس کے مندرجات نہایت چشم کشا ہیں۔ اس کتاب میں پہلی مرتبہ تفصیل کے ساتھ اس بات کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ عالم اسلام کی اس نوع کی دوسری جماعتوں سے قطع نظر پچھلی نصف صدی سے زیادہ عرصے سے جماعت خود کو جمہوریانے کے عمل میں پوری طرح کوشاں رہی ہے۔ مصنف کے مطابق جماعت اسلامی کی بنیادی فکر میں تبدیلی کی شروعات 1960 سے ہوئی جب علما وعوام کی اکثریت کی طرف سے جس میں علمائے دیوبند پیش پیش تھے، پوری طرح جماعت کے اس نظریے کو مسترد کر دیے جانے پر جماعت نے دو الیکشن کے مکمل بائیکاٹ کے بعد تیسرے الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا (ص:218) یہ دلچسپ بات ہے کہ 1951-52 کے الیکشن میں امیر جماعت نے الیکشن میں مسلمانوں کے حصہ نہ لینے کے لیے باضابطہ مہم چلائی۔ لیکن 1980 میں خود اپنے ارکان کو اس کی اجازت دینی پڑی (ص:197) جب کہ 2002 کے الیکشن میں اس نے سیکولر پارٹیوں کی جیت کے لیے باضابطہ انتخابی مہم چلائی۔ (ص:220)

نصف صدی کے عرصے میں حکومت الٰہیہ کو اپنا واحد نصب العین ہدف قرار دینے والی اور سیکولر جمہوریت کو ''طاغوت'' اور ''جاہلیت'' اور ''خنزیر کی طرح حرام'' تصور کرنے والی جماعت اسی سے اپنا رشتہ استوار کرتی رہی ہے۔ مولانا مودودی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سمیت تمام جمہوری عصری اداروں کو ''قتل گاہ'' قرار دیا تھا لیکن اب انہی قتل گاہوں میں جماعت اسلامی زندگی کی تلاش میں ہے۔ مصنف نے کتاب کے ساتویں اور آخری باب (ص:216-188) میں جماعت کے اس قلب ماہیت کا مدلل ومفصل تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ پوری 'داستان عبرت' دل چسپ اور قابل مطالعہ ہے۔ جماعت کی سرپرستی میں چلنے والے علی گڑھ کے کریسنٹ اسکول کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس پر سرے سے کسی آئیڈیالوجی کا کوئی اثر نہیں ہے۔ اس میں اور عام اسکولوں میں کوئی فرق نہیں۔ طلبہ کے والدین کی اکثریت اسکول کے پس منظر سے واقف بھی نہیں، اس کے کارکنان کو اس کا احساس بھی نہیں۔ افراد اور اداروں کی سطح پر جماعت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جماعت کا دعویٰ خواہ جو بھی ہو لیکن جماعت کی خاموش ترجیح سیکولر جمہوریت سے ہی قربت تلاش کرنا رہی ہے۔ اپنی تحقیق اور تجزیے کی بنیاد پر مصنف اس خیال کو غلط ٹھہراتے ہیں کہ جماعت کے اندر یہ تبدیلی محض ظاہری ہے۔ ان کی نظر میں اس تبدیلی کا تعلق جماعت کے اندرون سے ہے۔ خود اس کے فکری ڈھانچے میں گہرائی کے ساتھ تبدیلی آئی ہے۔ (ص:2)

کتاب کا چوتھا، پانچواں اور چھٹا باب جماعت اسلامی کی فکری بنیاد پر قائم ہونے والی دو طلبہ تنظیموں: سیمی (SIMI) اور ایس آئی او (SIO) کے تقابلی مطالعے پر مشتمل ہے۔ اس کے لیے مصنف نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، اعظم گڑھ میں جماعت کی طرف سے قائم مدرسے جامعۃ الفلاح میں فیلڈ ورک کے طور پر کافی وقت گزارا اور دونوں تنظیموں سے منسلک طلبہ کی تنظیمی واجتماعی سرگرمیوں کو قریب سے دیکھنے، پرکھنے کی کوشش کی۔ دونوں تنظیموں پر وہاں کے طلبہ اور کارکنان واساتذہ سے قائم

> کئی سالوں کے مسلسل مطالعے اور پرمشقت فیلڈ ورک پر مشتمل یہ کتاب کئی حیثیتوں سے انفرادیت رکھتی ہے۔ اس کے مندرجات نہایت چشم کشا ہیں۔ اس کتاب میں پہلی مرتبہ تفصیل کے ساتھ اس بات کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ عالم اسلام کی اس نوع کی دوسری جماعتوں سے قطع نظر پچھلی نصف صدی سے زیادہ عرصے سے جماعت خود کو جمہوریانے کے عمل میں پوری طرح کوشاں رہی ہے۔ مصنف کے مطابق جماعت اسلامی کی بنیادی فکر میں تبدیلی کی شروعات 1960 سے ہوئی جب علما وعوام کی اکثریت کی طرف سے جس میں علمائے دیوبند پیش پیش تھے۔

http://www.aalamisahara.com/05022011/printPage.aspx?beginpage=6&endpage=7 27/05/2011

ملاقاتیں کر کے دونوں گروپ کے طلبہ وکارکنان کی ذہن کی ساخت اور اس کے تشکیلی عوامل کو سمجھنے کی جدوجہد کی تاکہ ایک ہی پس منظر رکھنے والے دونوں طلبہ گروپوں کے بالترتیب اعتدال پسندی اور ریڈیکلزم کے رویے کے بنیادی اسباب کا اندازہ کیا جاسکے۔ مصنف کی نظر میں سیمی کی انتہا پسندانہ ذہنی تشکیل میں بنیادی طور پر ہندوتو طاقتوں کے 80 اور 90 کی دہائیوں کے عروج نے اہم رول نبھایا ہے۔ خاص طور پر بابری مسجد کے انہدام اور اس کے مابعد ملک گیر فسادات نے سیمی کو ہندوستان جیسے ملک میں بھی جہاد کا راستہ اختیار کرنے پر مائل کیا۔ قابل غور ہے کہ مصنف کے مطابق، 1991 سے قبل سیمی کے اندر جہاد کا رجحان نہیں پایا جاتا تھا۔ ان کا مطالعہ جن نتائج پر مشتمل ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی نظر میں سیمی کا ظاہرہ (phenomenon) ہندوستان کے سیکولر جمہوری نظام کی ناکامی کی پیداوار ہے۔ سیمی کے جماعت کی سرپرستی سے محرومی اسی کے ساتھ اس سے متعلق طلبہ کے سماجی پس منظر کو بھی کافی دخل رہا ہے۔ سیمی کے کارکنان شہری علاقوں اور خوش حال خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد اور سرپرستوں کی تعلیم مدارس کے ساتھ عصری درس گاہوں میں بھی ہوئی ہے، وغیرہ۔ ایس آئی او کی صورت حال بہت حد تک اس کے برعکس ہے۔ جس کی قابل ذکر تفصیلات مصنف نے پیش کی ہیں۔

یہ مطالعہ اس بات کو ثابت کرتا ہے اور مصنف کا اپنا نقطہ نظر بھی ہے کہ اسلام پسندی کا نظریہ کوئی جامد اور بے لچک نظریہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ بہت سے دوسرے نظریات کی طرح ایک متحرک نظریہ ہے۔ جس میں زمانی ومکانی احوال وواقعات کے نتیجے میں ہمیشہ تبدیلی کی گنجائش رہتی ہے۔ ہم اسے اس پورے مطالعے کا حاصل کہہ سکتے ہیں۔ اسلام پسندی سے متعلق خاص طور پر مغرب کے سیاسی فکری حلقوں میں اس وقت جو نظریات پائے جاتے ہیں، یہ نظریہ بہت حد تک ان سے مختلف اور حوصلہ افزا ہے۔ اس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ حالیہ عرصے میں مختلف ملکوں کی اسلامی تحریکات کے اندر جو انتہا پسندانہ رجحانات سامنے آرہے ہیں وہ عبوری ہیں مستقل نہیں۔ مشرق وسطی میں ان رجحانات کی پرورش میں وہاں کے غیر جمہوری سیاسی ماحول کا بنیادی دخل رہا ہے جس کی بقا انہی عالمی طاقتوں کی رہین منت ہے جو ان تحریکات سے سب سے زیادہ خائف ہیں۔ یہ پیرا ڈائم فکر کا اہم مقام ہے۔

اسلامی اور سیاسی حلقوں کے لیے یہ مطالعہ ایک اہم بنیاد فراہم کرتا ہے کہ وہ ان کمزوریوں کا جائزہ لے سکیں جو بعض مسلم گروپوں میں انتہا پسندی کے فروغ کا سبب بنی ہیں یا بن رہی ہیں۔ خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ عرفان احمد نے نہایت مدلل طور پر اس بات کو ثابت کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے کہ بعض مسلم حلقوں میں ریڈیکل رجحانات کی پیدائش اور افزائش کا تعلق مذہبی نظریات سے نہیں، جیسا کہ ہن ٹنگٹن اور برنارڈ لوئس جیسے لوگ کہتے رہے ہیں، بلکہ اس کا تعلق سماجی حالات سے ہے۔ مذہبی نصوص کی تشریح وتطبیق افراد اور جماعتوں کی خود اپنی تاثر پذیر ذہنیت کا مرہون منت ہوتی ہے۔ یہ بشریاتی مطالعہ انتہا پسندی کی جڑوں کی تلاش ودریافت کے لیے کیے گئے حالیہ مطالعات میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستان کے تعلق سے اپنی نوعیت کا یہ پہلا مطالعہ ہے جو اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے ایک مضبوط زمین فراہم کرتا ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب سے سوچنے والوں کو نئی جہت ملے گی اور بہت سی ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہوسکے گا جو اب تک مسلم اور غیر مسلم فکری وسیاسی حلقوں میں پائی جاتی رہی ہیں۔

ڈاکٹر عرفان احمد ہندوستان کے صوبہ بہار سے تعلق رکھنے والے نوجوان وذہین قلم کار ہیں۔ طالب علمی کے زمانے سے مختلف اہم موضوعات پر لکھتے رہے ہیں۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی ہے اور اس وقت وہ آسٹریلیا کی موناش یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

w.mazhari@gmail.com

نام کتاب :
ہندوستان میں اسلام اور جمہوریت:
جماعت اسلامی کی قلب ماہیت
مصنف : عرفان احمد
صفحات : 306
قیمت : 695
ناشر : Permanent Black
'Himalayana, Mall road, Rani Khet Cantt. Rani Khet'
(India)263645

"
اسلامی اور سیاسی حلقوں کے لیے یہ مطالعہ ایک اہم بنیاد فراہم کرتا ہے کہ وہ ان کمزوریوں کا جائزہ لے سکیں جو بعض مسلم گروپوں میں انتہا پسندی کے فروغ کا سبب بنی ہیں یا بن رہی ہیں۔ خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ عرفان احمد نے نہایت مدلل طور پر اس بات کو ثابت کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے کہ بعض مسلم حلقوں میں ریڈیکل رجحانات کی پیدائش اور افزائش کا تعلق مذہبی نظریات سے نہیں، جیسا کہ ہن ٹنگٹن اور برنارڈ لوئس جیسے لوگ کہتے رہے ہیں، بلکہ اس کا تعلق سماجی حالات سے ہے۔ مذہبی نصوص کی تشریح و تطبیق افراد او ر جماعتوں کی خود اپنی تاثر پذیر ذہنیت کا مرہون منت ہوتی ہے۔
"

http://www.aalamisahara.com/05022011/printPage.aspx?beginpage=6&endpage=7 27/05/2011